امام بخش ناسخ

اردو غزل کے نامور شاعروں میں بے شک ناسخ کا شمار نہیں لیکن ان کے بغیر اردو غزل کا ذکر کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہماری زبان کے بہت سے غزل گو شاعر ہیں، ناسخ جن کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچتے لیکن غزل گوئی کے فن میں انھوں نے جس "استادی" کا مظاہرہ کیا وہ آج تک ہمارا کوئی شاعر نہیں کر سکا۔

ناسخ کا رنگِ سخن ان کے اپنے زمانے میں اتنا مقبول تھا کہ بڑے بڑے شاعروں نے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اپنانے کی کوشش کی مگر اسے اپنانا آسان نہ تھا۔ کسی کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ مومن اور غالب غزل کے کیسے لاجواب شاعر ہیں۔ دونوں ہی نے ناسخ کی پیروی کرنی چاہی مگر ناکام رہے۔ مومن سے زیادہ غالب پر ناسخ کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ ایک شعر میں کلامِ میر کی پسندیدگی کے سلسلے میں وہ بہت فخر سے ناسخ کی ہمنوائی کرتے ہیں ـــــ

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب نے اپنے بہت سے شعروں اور بہت سی غزلوں کو قلم زد کر کے ایک منتخب دیوان مرتب کیا تھا مگر اس منتخب دیوان میں بھی بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن پر ناسخ کی پرچھائیں صاف نظر آتی ہے۔

ناسخ اپنے عہد کے ادبی ڈکٹیٹر تھے۔ یہ بات بار بار کہی گئی اور بالکل سچ کہی گئی۔ اردو شاعری کی دنیا پر ایک مدت تک ان کی حکمرانی قائم رہی۔ زبان و بیان کے بارے میں ان کے فیصلے حرفِ آخر کا حکم رکھتے تھے۔ جو بات ان کی زبان سے نکل گئی بس وہی سند تھی۔ ناسخ دراصل شاعر سے زیادہ مصلحِ زبان تھے اور اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ان کی کوششیں اور کاوشیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان کی اس

کوشش نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور کامیاب ہوئی کیونکہ یہ اپنے زمانے کا تقاضا تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاح کی دھن میں ناسخ نے بہت سے اچھے لفظوں کو بھی خارج کر دیا جس سے زبان کا دائرہ تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ محدود ہو گیا لیکن بہت سے ثقیل الفاظ دور ہوئے تو زبان کا بوجھل پن کم ہو گیا۔ یہ ایک الگ بحث ہے اور یہاں اس کا موقع بھی نہیں کہ ناسخ کی اصلاحی تحریک میں کیا خوبیاں تھیں اور کیا خرابیاں۔ لیکن اتنا عرض کرنا بہرحال ضروری ہے کہ اس تحریک نے اردو زبان و ادب پر ایک گہرا نقش چھوڑا۔ انھوں نے اصلاحِ زبان کے سلسلے میں جو اصول مرتب کیے ان پر بڑی حد تک خود بھی عمل کیا اور اپنے شاگردوں سے بھی عمل کرایا۔ اور ان شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ زبان کے معاملے میں ناسخ نے راہبری کی زبردست خدمت انجام دی اسی لیے وہ استاذالاساتذہ کہلائے۔ ڈاکٹر شبیہہ الحسن تحریر فرماتے ہیں ـــــ

"ناسخ کو ان کے عہد میں استاذالاساتذہ سمجھا جاتا تھا۔ جب شاعروں میں غزل خوانی کی نوبت ان تک پہنچتی تھی تو ان کے نمودار شاگردوں اور قدردانوں میں سے کوئی شخص اسی لقب کے ساتھ حاضرینِ مشاعرہ کو متوجہ کرتا تھا۔ بے شک ان کے استاد ہونے میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان نے ان سے بڑے غزل گو پیدا کیے ہیں مگر ان سے بڑا استاد اب تک نہیں پیدا کیا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ میر، غالب، اقبال جیسے شاعروں کے نام سے کوئی اسکول وابستہ نہیں جبکہ "ناسخ اسکول" کے نام سے ادب کا کون سا طالب علم ناواقف ہوگا۔ آئیے اب یہ غور کریں کہ ناسخ اسکول سے کیا مراد ہے اور ناسخ کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں۔

شاعری کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ فکر و خیال کی شاعری، جذبہ و احساس کی شاعری اور تیسرے نمبر پر وہ شاعری جس میں خیال جذبہ بن جائے یا جذبہ و خیال گھل مل جائیں۔ اور یہی سچی اور اعلیٰ شاعری ہے۔ ناسخ کے یہاں جذبہ و احساس کی کمی ہے۔ یہی ان کی کمزوری ہے۔ وہ خیال کے شاعر ہیں۔ جذبہ شدید ہو سکتا ہے، گہرا ہو سکتا ہے مگر اس میں پیچیدگی نہیں ہوتی۔ خیال کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس میں پیچیدگی اور الجھاؤ بھی کچھ ممکن ہے۔ کسی خیال کی پیشکش کے لیے شاعر کو مختلف شعری وسائل سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر یہ وسائل خیال کو سلجھانے میں معاون ہوں تو یہ خوبی ہے اور اگر

Scanned by TapScanner

یہ خود اہم بن جائیں تو یہ عیب ہے۔ یہی ناسخ کی کمزوری ہے۔ ان کے کلام میں صنعت گری حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ ان کے شعروں کی بڑی تعداد ایسی ہے کہ خیال کے بجائے لفظ ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور ان کی شاعری محض لفظوں کا کھیل بن کر رہ جاتی ہے۔ دیکھیے چند شعر ـــــ

دن سیہ، رات سیہ، ماہ سیہ، سال سیاہ　　دل سیہ، بخت سیہ، نامۂ اعمال سیاہ
ایک میں اور ہیں یہ چار بلائیں کالی　　خط سیہ، زلف سیہ، چشم سیہ، خال سیاہ

بات جن نازک مزاجوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی　　بوجھ ان سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اٹھا

ناسخ کے کلیات سے اس طرح کے صدہا اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے صاف پتا چلتا ہے کہ دماغ پر زور ڈال کے اور کوشش کر کے کوئی مضمون نکالا ہے۔ مثلاً نازک مزاجوں کو منوں مٹی کے تلے دبے دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ جو لوگ کسی کی ذرا سی بات برداشت نہ کر سکتے تھے انھوں نے مٹی کا اتنا وزن کیسے برداشت کر لیا۔ پھر بات اٹھنا اور وزن اٹھنا جیسے محاورات کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ شاعر نے دماغ پر زور ڈال کے یہ مضمون پیدا کیا۔ یہ شاعری نہ ہوئی زور آزمائی اور کرتب بازی ہو گئی۔ لیکن ان کے قلم سے بہت سے ایسے شعر بھی نکل گئے ہیں جن میں دلکشی پائی جاتی ہے اور کسی نہ کسی درجے میں وہ ہمیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آئیے ایسی چند مثالیں بھی دیکھتے چلیں ـــــ

ہم خواب میں واں پہنچے، تدبیر اسے کہتے ہیں　　وہ نیند سے چونک اٹھے، تقدیر اسے کہتے ہیں
وہ مجھ سے گریزاں تھا، کل اس کو میں گھر اپنے　　باتوں میں لگا لایا، تقریر اسے کہتے ہیں

صنعتوں کی طرف ناسخ کا دل بہت کھینچتا ہے اور رعایت لفظی کے تو وہ خاص طور پر دلدادہ ہیں۔ اس لیے زیادہ تر ان کی شاعری شعبدہ بازی بن کر رہ گئی ہے۔ پھر بھی بہت سے شعر گوارا ہیں اور بعض دلکش۔

ناسخ نے ایک شعر میں میر کا معتقد ہونے کا اعلان کیا ہے۔ دوسرے اردو شاعروں کی طرح ناسخ نے بھی میر کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے لیکن میر سے ان کا مزاج میل نہیں کھاتا۔ انھیں ذہنی مناسبت ہے تو سودا سے۔ سودا کی خارجیت، بلند آہنگی اور نشاطیہ لہجہ کسی نہ کسی حد تک ناسخ کے یہاں مل جاتا ہے لیکن ناسخ کی جو شاعری اپنی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتی ہے وہ بھی کلام سودا کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ ناسخ کا مشاہدہ وسیع ہے وہ اپنے اردگرد پھیلی دنیا کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں لیکن یہاں بھی وہ سودا سے مات کھا جاتے ہیں۔

ناسخ کا کلام خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ بے شک ان کے یہاں خامیاں زیادہ اور خوبیاں کم ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ناسخ کے محاسنِ شعری کو جس حد تک سراہنے کی ضرورت تھی اس حد تک نہیں سراہا گیا۔ ناقدینِ ادب نے ان کے کلام میں عیب ہی زیادہ گنائے۔ کسی نے کہا انھوں نے صرف گیارہ شعر کہے، کسی نے گھٹا کے تعداد صرف ساڑھے تین کر دی اور کسی نے تو یہاں تک کہا کہ برسوں کی محنت اور سخت ریاضت کے باوجود وہ ایک بھی جاندار شعر نہ کہہ سکے۔

یہ کہنا انصاف نہیں ہے کہ ناسخ کا کلیات لفاظی، تصنع، مبالغہ آرائی سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں تک بندی، قافیہ بازی گری اور شعبدہ بازی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا بلکہ اصلیت وہ ہے جس کی طرف ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اشارہ کیا ہے :

> "ان کے دیوان میں بہت سے ایسے شعر بھی موجود ہیں جنھیں سن کر میر اور غالب بھی کھلے دل سے داد دیں۔ صنائع اور بدائع کی اُس موسلا دھار بارش میں جو ہمیں ناسخ کے دیوان میں ملتی ہے، جذبہ اور احساسات کی شدت کا کوندا بھی اکثر نظر آ جاتا ہے اور رعایتِ لفظی کے گرجتے ہوئے بادلوں میں گرمیِ دل کا پیدا کردہ بجلی کا لپکا بھی دکھائی دے جاتا ہے۔"

ناسخ کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں نہ سہی لیکن استادانِ فن میں انھیں ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ان کا کارنامہ یقیناً یاد رکھنے کے قابل ہے۔۔ ⁂ ⁂

خواجہ حیدر علی آتش

کھینچ دیتا ہے شبیہہ شعر کا خاکا خیال
فکرِ رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

یہ ہے آتش کا نظریۂ شعر۔ مطلب یہ کہ آتش کی رائے میں شاعر کا رنگین، دلکش خیال تصویر بن کر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور اس خیال کی پیشکش میں شاعر لفظوں کو ایسے سلیقے سے ترتیب دیتا ہے جیسے کوئی جوہری نگینوں کو جڑتا ہے۔ خود آتش کا کلام اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

فکر میں رنگینی، خیال میں رعنائی اور اندازِ بیان میں یہ شان کہ جیسے کسی نے موتی پرو دیے ہوں اسی وقت ممکن ہے جب فن کار کے دل میں خوشیوں کا سمندر موجیں مار رہا ہو۔ اردو شاعری پر بالعموم حزن و یاس کی فضا چھائی رہی۔ جب اردو شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوا تو صورتِ حال بدلی۔ لکھنؤ میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ ہر طرف خوش حالی تھی۔ عیش و عشرت کے اسباب مہیا تھے۔ نتیجہ یہ کہ شاعر کے سر سے بھی رنج و غم کے بادل ہٹ گئے۔ شاعری میں نشاطیہ عنصر داخل ہوا۔ اردو شاعری کو لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کا یہ سب سے بیش قیمت تحفہ ہے کیونکہ بقول مجنوں گورکھپوری اعلا درجے کی شاعری وہ ہے جس میں حزن و ملال کا نہیں بلکہ امید و مسرت کا پلّہ بھاری ہو۔ امانت علی سحر کا ایک شعر ہے ——

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانہ شادی ہے، ہر اک کوچہ ہے عشرت کا

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے ماحول میں کیسی بے فکری اور کیسی خوشی موجود تھی۔ اس کا اظہار لکھنؤ کی شاعری میں بھی ہوا۔ بے شک اس بے فکری اور عیش پسندی نے اردو شاعری میں کچھ عیب بھی داخل کر دیے لیکن آتش کا کلام ان عیبوں سے پاک ہے۔

آتش کے کلام میں اداسی، پسپائی اور شکست خوردگی نہیں بلکہ رجائیت، بلند حوصلگی اور جوانمردی

نظر آتی ہے۔ وہ ناموافق حالات سے خوف زدہ نہیں ہوتے، ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس کا سبب صرف لکھنؤ کا پر آسایش ماحول ہی نہیں بلکہ خود آتش کا قلندرانہ مزاج بھی ہے۔ سید عبداللہ کی یہ رائے درست ہے کہ آتش کے خاندان میں طریقت کی پیروی موجود تھی مگر مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ وہ خود طریقت کے سلسلے سے منسلک نہیں ہوئے۔ البتہ قلندرانہ وضع اور آزاد زندگی رکھتے تھے۔ بے نیازی اور قناعت ان کی طبیعت کے اوصافِ خاص تھے۔ شاید بھنگ کا شغل بھی کرتے تھے۔ ہر وقت اپنے دل کی دنیا میں گم اور سرمست رہتے تھے۔

آتش کی بے نیازی اکثر بد دماغی اور تنک مزاجی کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد میں بوریے پر بیٹھے رہتے تھے۔ بڑے بڑے رئیس اور نواب تلامذہ میں شامل تھے۔ ان میں سے اکثر وہاں حاضر ہوتے۔ استاد سر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ کوئی شاگرد بوریے پر بیٹھ گیا تو خفا ہوتے تھے کہ اچھا اب بیٹھنے کے لیے اجازت کی ضرورت بھی نہ رہی۔ کوئی چپ چاپ کھڑا رہا تو ذرا دیر بعد سر اٹھا کر دیکھتے اور طنزیہ لہجے میں فرماتے۔ ہاں میاں رئیس زادے ہو، بوریے پر بیٹھنا کسرِ شان خیال کرتے ہو۔ غرض کہ عجب تیکھا مزاج پایا تھا۔ اس لیے دنیا کے غم و آلام کو ہیچ پوچ خیال کرتے تھے۔ بے باکی اور بے خوفی مزاج میں داخل تھی۔ وہی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ زندگی کے سلسلے میں پُر امید رویہ ان کی شاعری کا وصفِ خاص ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ——

ہوائے دورِ مے خوش گوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

ایک اور مشہور غزل کا شعر ہے ——

بحرِ الفت میں تباہی کا ہے اندیشہ کسے؟
ناخدا جو نہیں رکھتے وہ خدا رکھتے ہیں

ان کے مزاج کا یہ تیکھا پن انھیں محبوب کے آگے رونے اور گڑگڑانے سے روکتا ہے۔ ان کی بے باکی کا حال تو یہ ہے کہ

وہ نہیں ہوں کہ رُکھائی سے میں ٹل جاؤں گا
آج جاتا تھا تو ضد سے تری کل جاؤں گا

یوں بھی وہ ہجر کے نہیں وصال کے شاعر ہیں۔ دیکھیے ——

Scanned by TapScanner

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید　　سوتے ہیں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

ان کی قناعت و خودداری کا یہ عالم ہے ——

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے　　پھیلائیے نہ ہاتھ، نہ دامن پسارئیے

آتش نے اپنے شعر کی بندشِ الفاظ کو نگینے جڑنے سے تشبیہہ دی تو بعض ناقدوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ان کے نزدیک مینا کاری ہی شعر میں سب کچھ ہے۔ بے شک وہ مرصع سازی کو شعر کی بہت بڑی خوبی خیال کرتے ہیں لیکن انھیں اپنے اشعار کے "روشن" اور "تہ دار" معانی پر بھی ہمیشہ فخر رہا۔ فرماتے ہیں ——

اپنے ہر شعر میں ہے معنیِ تہ دار آتش　　وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

مکیں ہر معنیِ روشن، مکاں ہر بیتِ موزوں ہے　　غزل کہتے نہیں ہم چند گھر آباد کرتے ہیں

دیوانِ آتش کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جو تجربات ان کے اشعار میں پیش ہوئے ہیں وہ نہایت اہم اور با وقعت ہیں۔ یہ رند مشرب اور قلندر وضع شاعر زندگی کی حقیقتوں پر گہری نظر رکھتا تھا اور نوعِ انسان کو درپیش مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتا تھا۔ اس لیے دیوانِ آتش زریں اور بیش قیمت تجربات سے معمور ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں ——

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں　　لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر　　دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

نازک دلوں کو شرط ہے آتش خیالِ یار　　شیشہ خدا جو دے تو پری کو اتاریے

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے　　دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوے دوست

ان مثالوں سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آتش کی توجہ صرف معانی پر نہیں رہتی بلکہ اندازِ بیان کو بھی وہ زیادہ سے زیادہ دلکش و پُر اثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصوری یا پیکر تراشی اُن فنی تدابیر میں سے ایک ہے جن سے شعر کے حسن میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ آتش کا ایک شعر ہے ——

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصوّر پیشہ ہیں کوئی　　نئے نقشے، نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

پیکر تراشی میں شاعر استعارہ و تشبیہہ سے بطورِ خاص کام لیتا ہے۔ ایک شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر نے اپنے دل کو شیشے سے زیادہ نازک اور مزاجِ محبوب کو اپنے دل سے بھی زیادہ نازک کہہ کر تشبیہہ در تشبیہہ کی ایک اچھوتی مثال پیش کی ہے۔ دیکھیے استعارہ و تشبیہہ کی چند مثالیں ——

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے　　ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر　　دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

لہجے کی ملائمت آتش کے شعروں میں ایک خاص قسم کی نغمگی پیدا کرتی ہے۔ لفظوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں آتش بہت احتیاط اور توجہ سے کام لیتے ہیں۔ لکھنؤ کے رواج کے مطابق انھوں نے لمبی لمبی ردیفیں بھی اختیار کیں مگر ایسی سلیقہ مندی سے کہ داد دینی پڑتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ——

عشق کے سودے سے پہلے دردِ سر کوئی نہ تھا
نکلتی کس طرح ہے جانِ مضطر دیکھتے جاؤ
گدا نواز کوئی شہسوارِ راہ میں ہے
حسرتِ جلوۂ دیدار لیے پھرتی ہے

ان کے علاوہ: "نہ ہوا تھا سو ہوا، جو آگے تھی سو اب بھی ہے" ہے کہ جو تھا۔" ان غزلوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ لمبی سے لمبی ردیفوں کو سلیقے سے نبھا دینے کا ہنر آتش کو خوب آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان لمبی ردیفوں سے ایسی دھن پیدا ہوتی ہے جو غزلوں میں جان سی ڈال دیتی ہے۔

آتش ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی فکر بھی اعلا درجے کی ہے اور فن کے تقاضے بھی ان کی نظر میں رہتے ہیں۔ اس لیے ان کا کلام ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا اور ہمیشہ دیکھا جائے گا۔ ان کا کلام اور بھی بلند رتبہ ہوتا اگر وہ اس عہد کے تقاضوں اور لکھنؤ کے ماحول سے مجبور نہ ہوتے۔ ان کا مقابلہ ناسخ سے تھا جن کے نزدیک شاعری ایک مقدس فن کا نہیں بلکہ پینترے بازی کا نام تھا۔ ناسخ کے کلام میں تصنّع کا رنگ غالب ہے۔ غیر معمولی ردیف، اور لفظوں کے الٹ پھیر سے وہ قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ آتش نے ہمیشہ اس شعبدہ بازی سے دور رہنے اور دل پر گزری ہوئی واردات کو پورے فنی ادب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ آتش اور ناسخ دونوں کا شمار دبستانِ لکھنؤ کے بانیوں میں ہوتا ہے لیکن اس دبستان کی خامیاں دیکھنی ہوں تو دیوان ناسخ کی ورق گردانی کیجیے اور اس دبستان کی خوبیاں تلاش کرنی ہوں تو آتش کا دیوان کھول لیجیے۔ آتش نے اپنی ایک غزل کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ ان کے پورے کلام پر صادق آتا ہے۔ فرماتے ہیں:

گو مدّعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

* *

Scanned by TapScanner